30

مجلس اقبال

نذیر احمد

میں نے اپنے مقالہ (۱) کا عنوان اقبال کے اس شعر سے لیا ہے۔

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

اقبال کی مجلس اس کے بے نظیر کلام کا وہ میکدہ ہے جس میں آنے کے لئے وہ بار بار یاران نکتہ داں کو صلائے عام دیتا ہے کہ بیباکانہ اندر آؤ اور اس میکدۂ علم و عرفان، اس میخانۂ ذوق و شوق سے اپنی ہمت، بساط اور ظرف کے مطابق دو چار، دس بیس، عقل و خرد کے اور جذب و مستی کے ایسے جام پیو جن سے بیہوشی کی بجائے تمہاری آنکھوں میں نور، دل میں سرور اور دماغ میں فہم و ادراک کی لہریں موجزن ہوں۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اپنے انتخاب کے تین چار جام آپ کے سامنے پیش کروں میں بطور تمہید اس نکتہ کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس شعر میں علامہ نے حقیقت سے چشم پوشی اور ظاہر پرستی پر طنزیہ انداز میں جرح کی ہے۔ جن لوگوں کو اقبال سے ملاقات کا شرف حاصل تھا یا جنھوں نے ان کے کلام کا غور و خوض سے مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ اقبال کی طبیعت، مزاج اور افتاد میں حقیقت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اور ان کو ہر طرح کی ظاہر داری اور ظاہر پرستی سے، جس میں ریا اور عیاری بھی شامل ہیں، سخت نفرت تھی جس کا اظہار انہوں نے بارہا اپنے کلام میں کیا ہے حتیٰ کہ دورحاضر کے مسلمانوں کی حقیقت سے دوری اور توہم پرستی کو دیکھ کر وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

حقیقت روایات میں کھو گئی
یہ امت خرافات میں کھو گئی

ہمارے یہاں آج کل یہ بات عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ اگر کسی شخص نے انگریزی لباس زیب تن کر لیا تو دوسرے لوگ اور وہ خود

۱- یہ مقالہ یوم اقبال کی تقریب میں مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۷۲ء پڑھا گیا۔

بھی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ جدید علم اور ترقی پذیر ذہنیت کی دولت سے مالا مال ہیں ، یا اگر کسی نے جبہ اور عمامہ زیب تن کیا تو ان کے متعلق یہ خوش فہمی ہو جاتی ہے کہ وہ نہ صرف علوم نقلیہ میں ماہر ہیں بلکہ ان کا کردار بھی ایک مثالی مسلمان کا ہے ۔ حالانکہ ہر حال میں دونوں باتیں درست نہیں ہوتیں اور حقیقت ظاہر کے خلاف ہوتی ہے ۔ چونکہ عام طور پر قلندر کی ظاہری علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس کے سر کے بال منڈے ہوئے ہوں ، اس لئے اقبال اس ظاہر پرستی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مجھے دیکھو کہ گو میں نے اپنے بال نہیں ترشوائے لیکن میں رموز قلندری سے خوب واقف ہوں اور آپ کو بھی یہ چاہیئے کہ ظاہر کے ملمع سے دھوکا کھانے کی بجائے جوہر حقیقت پر نظر رکھیں تا کہ دام مکر و فریب میں گرفتار نہ ہو جائیں ۔

اس مختصر تمہید کے بعد میں ان اشعار کی طرف رجوع کرتا ہوں جو میں نے اس مقالہ کے لئے منتخب کئے ہیں - ان میں پہلا شعر یہ ہے ۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

میں نے اس شعر کو بارہا پڑھا اور سوچتا رہا کہ اقبال کے ذہن میں وہ کونسی خاص صفات تھیں جن کی بنا پر وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ روز ازل سے چراغ مصطفوی اور شرار بولہبی میں جنگ جاری ہے ۔ یوں تو دونوں ہستیوں کے کردار میں زمین آسمان کا فرق تھا، ایک ہستی مجسمۂ شرافت تھی تو دوسری نمونۂ شرارت ، ایک ہستی آیۂ رحمت تھی تو دوسری علمبردار ظلم ، ایک پیکر ہدایت تھی تو دوسری نمائندۂ ضلالت ، ایک حامل خلق عظیم تھی تو دوسری مائل فتنہ و فساد ، لیکن اس تضاد کے باوجود میری دلی تشفی نہ ہوئی کیونکہ میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ دونوں ہستیوں میں وہ کون سی خاص صفات ہیں جن کی طرف اقبال ہماری توجہ اس طرح مرکوز کرنا چاہتا ہے جس طرح ایک عدسیہ روشنی کو ایک نقطۂ ماسکہ پر مرکوز کر دیتا ہے ۔ اس دماغی الجھن میں مجھے یہ خیال آیا کہ چونکہ اقبال کے خیالات اور وجدان کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے اس لئے اس شعر کے صحیح معنی سمجھنے کے لئے قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے قرآن شریف میں انبیاء کرام اور ان کے متعلقات کے علاوہ صرف دو آدمیوں کا نام کے ساتھ ذکر آیا ہے، جن میں ایک ابولہب ہے جس کے متعلق سورۃ لہب میں ارشاد ہے :

"تبت یدا ابی لھب و تب ۔ ما اغنیٰ عنہ مالہ و ما کسب ۔ سیصلیٰ ناراً ذات لھب (۱۱۱ : ۱۰۳)۔ [ترجمہ :- ابولھب کے ھاتھ ٹوٹ گئے اور وہ ھلاک ھوا ۔ نہ اس کا مال ھی اس کے کام آیا نہ جو کچھ اس نے کمایا۔ وہ (جلد بھڑکتی ھوئی) آگ میں داخل ھوگا[1]۔ ان آیات میں نہ تو ابولھب کی شقاوت کا ذکر ھے نہ اس کے جور و ستم کا، نہ اس دشمنی کا جو اس کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے زندگی بھر رھی، نہ اس شدید مخالفت کا جو اسلام کی تحریک کے خلاف اس سے رونما ھوئی ۔ اگر ذکر ھے تو صرف اس بات کا کہ اس کے دل میں نہ صرف دنیاوی مال و دولت کمانے اور جمع کرنے کی بے اندازہ خواھش اور ھوس تھی بلکہ وہ صرف اس مال و دولت کو ھر مقصد کے حصول کا واحد ذریعہ سمجھتا تھا ۔ وہ اخلاقی اقدار کا قائل نہ تھا ۔ اس کے نزدیک سچائی اور دیانت داری کی کوئی قدر نہ تھی، نہ اس کے ایمان میں کسی فوق البشری طاقت یا ھستی کی کوئی گنجائش تھی ۔ اسے یقین تھا کہ مال و دولت ایسی کنجی ھے جس سے بڑی سے بڑی مشکل کا تالا کھولا جا سکتا ھے ۔ وہ اس جماعت کا نمائندہ تھا جس کے مسلک کو بعد میں ایک فارسی کے شاعر نے یوں بیان کیا ھے ۔

اے زر تو خدا نئی و لیکن بخدا
ستار عیوبی و قاضی الحاجاتی

آج کل کی اصطلاح میں وہ سو فیصد مادہ پرست (Materialist) تھا جس کی زندگی کی بنیادیں، ستون، دیواریں اور چھتیں تمام کی تمام مال و دولت، سیم و زر، اور دنیاوی ساز و سامان پر کھڑی تھیں ۔ اس تمام مال و دولت اور ساز و سامان کے باوجود وہ اپنے مقاصد کے حصول میں ناکامیاب رھا اور جو کچھ اس نے کمایا اور جمع کیا تھا، وہ مطلق اس کے کام نہ آیا بلکہ اس کی حالت ایک ایسے بے بس آدمی کی طرح ھوگئی جس کے ھاتھ کاٹ دیئے گئے ھوں اور اس حالت میں اس کا عبرت خیز انجام ھوا ھو ۔

اس کے برخلاف جب میں نے قرآن مجید کی روشنی میں سیرت رسول صلعم پر نظر ڈالی تا کہ معلوم کروں کہ وہ کون سی خاص صفت تھی جو شرار بولھبی اور چراغ مصطفوی میں ابدی جنگ کا ذکر کرتے وقت اقبال کے ذھن میں تھی تو معاً میرا خیال اس آیت کی طرف گیا کہ "قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین لا شریک لہ و بذالک امرت و انا اول المسلمین

(۶ : ۱۶۳-۴) [یعنی میری دعائیں ، میری عبادتیں ، میری زندگی اور میری موت سب کچھ صرف خدا تعالیٰ کے لئے ہے جو تمام عالمین کا پروردگار ہے اور جس کا (اس نذرانۂ عقیدت میں) کوئی شریک نہیں ۔ اس (نظریۂ حیات) کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور (اس حکم کی تابعداری میں) میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں] ۔ تو اس آیت کے مطابق آنحضرت صلعم نے اپنے نظریۂ حیات میں مادی اسباب و ذرائع کے علاوہ بلکہ ان کے اوپر ایک روحانی عنصر یعنی اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان اور مشیت الٰہی کی تکمیل کے لئے اپنی زندگی وقف کردینا بھی شامل کردیا ۔ روحانیت کا یہ عنصر جو ابولہب کے مادی نظریۂ حیات میں سے بالکل غائب تھا آنحضرت صلعم نے اپنی زندگی اور موت کے لئے بنیادی قرار دیا ۔ تو یہ ہے چراغ مصطفوی کا وہ بصیرت افروز اور سبق آموز نظریۂ حیات جسکی ازل سے ابولہب کے مادہ پرست نظریۂ حیات سے جنگ جاری ہے اور جس میں اگر ایک طرف ابولہب کو شکست اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ، تو دوسری طرف آنحضرت صلعم کے لئے بشارت ہوئی کہ ''رفعنا لک ذکرک (۹۴ : ۴)'' یعنی قیامت تک حضور کا ذکر ادب اور درود اور سلام کے ساتھ بلند تر ہوتا رہیگا ۔ سیرت مصطفوی کے متعلق جو آیت میں نے ابھی پڑھی ہے یعنی قل ان صلاتی ، اس میں دو اشارے بھی قابل غور ہیں ۔ پہلا اشارہ تو یہ کہ اس میں خدا تعالیٰ کی راہ میں زندگی اور موت دونوں کے نذرانے کا ذکر ہے ۔ اس سے انکار نہیں کہ کسی مقصد یا نظریہ کے لئے جان دینا مشکل کام ہے ، لیکن ہر صاحب نظر جانتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ مشکل یہ امر ہے کہ مقصد کے حصول یا نظریہ کی خاطر پوری زندگی وقف کر دی جائے ۔ اس لئے قرآن شریف میں زندگی کا ذکر موت سے پہلے ہے کیونکہ پوری زندگی وقف کردینا زیادہ دشوار ہے ۔ دوسرا اشارہ یہ کہ چونکہ آنحضرت صلعم نے اس آیت کے حکم کے مطابق اپنی عبادات، اپنی زندگی اور اپنی موت تمام کی تمام اللہ تعالیٰ اور اسکے دین کے لئے وقف کردیں تو مسلمانوں میں ان کا نمبر اول ہو گیا ، گویا ایک طرح کا معیار مقرر ہو گیا کہ کوئی مسلمان جسقدر اپنی عبادات ، اپنی زندگی اور اپنی موت صرف اللہ تعالیٰ اور اسکی خدمت کے لئے وقف کریگا اسی حساب سے مسلمانوں کی صفوں میں اسکا نمبر بڑھیگا اور اس نمبر کا تقرر صرف اسی لحاظ اور اسی معیار سے ہو گا نہ کہ حسب نسب سے یا لوگوں کی ستایش سے یا مال و دولت کی نمائش سے ۔ اس آیت سے یہ مطلب سمجھنا غلط ہوگا کہ انسان اپنے مقاصد کے حصول کے

لئے مادی ذرائع و اسباب کو بالکل خارج کردے۔ خود آنحضرت صلعم کی حیات بابرکات اس قسم کی تاویل کی نفی کرتی ہے کیونکہ آپ نے حصول مقاصد کے لئے اس زمانے میں جو مادی اسباب میسر تھے ان سے حتیٰ الوسع پورا پورا کام لیا اور اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کرتے ہوئے مولانا روم کے الفاظ میں پہلے اپنے اونٹ کے زانو باندھ لئے۔ فرق دونوں نظریوں میں یہ ہے کہ ایک طرف تو مادی اسباب پر سو فیصد بھروسہ ہے اور دوسری طرف مادی اسباب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھروسہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہے۔ پہلے نظریہ کے قایل ابولہب کی طرح اس وقت بالکل مایوس ہوجاتے ہیں جب ان کے پاس مادی اسباب نہیں رہتے۔ لیکن دوسرے نظریہ کے حامل لاتقنطو من رحمتہ اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے کبھی مایوس نہیں ہوتے خواہ انہیں عارضی ناکامی کا منہ دیکھنا نصیب ہو۔

دوسرا جام جو میکدہ اقبال سے میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ شعر ہے۔

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

معرکۂ کربلا اور امام حسین کی شہادت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور آئندہ بھی بہت کچھ لکھا جائیگا۔ لکھنے والوں کی صف وسط سے دائیں بائیں جانب بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے ایک سرے پر وہ لوگ ہیں جو اس معرکہ کو اس خانگی رقابت اور مناقشت کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھتے ہیں جو عبدالمناف کے دو بیٹوں یعنی ہاشم اور عبدالشمس میں شروع ہوئی اور جب تک اس کا سلسلہ چلا یہ کبھی کبھی رقابت اور مناقشت سے بڑھ کر کھلی خانہ جنگی کی صورت اختیار کرتی رہی۔ ان دونوں کے بعد ان کے بیٹوں امیہ اور عبدالمطلب کے درمیان جاری رہی۔ ان کے بعد امیہ کے بیٹے ابوسفیان اور عبدالمطلب کے پوتے آنحضرت صلعم میں تب تک چلتی رہی جب تک ابو سفیان حلقہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے۔ اسکے بعد آنحضرت صلعم کی نبوت اور آپ کی پہلے دو خلفا' کی زبردست اور بے لوث شخصیت کے ماتحت کچھ عرصے کے لئے یہ خاندانی مناقشت دب گئی۔ لیکن بعد میں ابوسفیان کے بیٹے امیر معاویہ اور بنوہاشم کے چشم و چراغ حضرت علی کرم کے درمیان نمودار ہو کر یزید ابن معاویہ اور حسین ابن علی کے مابین معرکہ کربلا کی روح فرسا صورت میں روپذیر ہوئی۔ جس میں طرفین خلافت یعنی امارت اور قیادت کے لئے

نبرد آزما تھے ۔ اس صف کے دوسرے سرے پر وہ لوگ ہیں جو اس معرکہ کو اسلام اور کفر کے درمیان ایک جنگ قرار دیتے ہیں ۔ میرے خیال میں یہ دونوں اسکول افراط اور تفریط کی حدوں تک جا پہنچے ہیں کیونکہ ایک طرف تو امام حسین کی شخصیت اس سے بہت بالاتر تھی کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر مسلمانوں میں خانہ جنگی کراتے اور اپنے خاندان کے افراد کو جن میں معصوم بچے بھی شامل تھے ، شہید کراتے جب کہ ان کو معلوم تھا کہ ان کے مختصر گروہ کو دشمنوں کی جماعت کے مقابلے میں فتح کی کوئی امید نہیں ۔ دوسری طرف آپ کے مخالف زبردست غلطی کے شکار اور گنہگار ضرور تھے لیکن اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہوئے وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج نہیں تھے ۔ ان میں کئی لوگ ایسے تھے جنکو صحابہ کرام سے نسبت تھی یہاں تک کہ اس لشکر کے سپہ سالار عمرو جلیل‌القدر صحابی حضرت سعد ابن ابی وقاص فاتح ایران کے بیٹے تھے ، اور شمر جسکے حصہ میں امام کا سر کاٹنے کی ابدی شقاوت آئی اس کی پھوپھی حضرت علی کرم کے عقد میں آچکی تھی۔ یہ وہ تاریخی واقعات ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اس لئے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس معرکہ کا پس منظر سمجھنے کے لئے ہمیں اسلامی تعلیم کی روشنی میں منصب خلافت اور اہلیت خلافت پر روشنی ڈالنا چاہیئے کیونکہ امام عالیمقام کے لئےبھی روشنی مشعل راہ ہوسکتی تھی ۔

جہاں تک منصب خلافت کا تعلق ہے اسکی بنیاد آیت ''امرھم شوری بینھم (۳۸ : ۴۲)'' کے مطابق صرف جمہوریت پر مبنی ہو سکتی ہے جس میں عوام مسلمانوں کو اس بات کا حق حاصل ہو کہ وہ تمام پہلوؤں پر غور کر کے اپنا امیر خود منتخب کریں نہ کہ کوئی فرد سازش یا طاقت کے زور سے ان پر مسلط ہو جائے ۔ اس انتخاب کا طریقہ کیا ہو ، اسکی وضاحت قرآن شریف نے نہیں کی کیونکہ یہ حالات اور ضروریات زمانہ کے ساتھ بدلتا رہیگا ، لیکن جمہوریت کا بنیادی اصول ہمیشہ مسلم رہیگا ، جہاں تک اہلیت کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ آزاد عوام مسلمان ایسے شخص کو اپنا امیر منتخب کریں گے جو قول و فعل میں ، علم و فہم میں ، تجربہ اور لیاقت میں اسلام اور مسلمانوں کی خیرخواہی اور خدمت میں سب سے زیادہ اس عزت کا اہل ہوگا ۔

ان بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں جب ہم یزید کی مسند نشینی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ دونوں لحاظ سے غلط اور قابل‌اعتراض تھی ۔ اول تو اسکی مسند خلافت پر نامزدگی سے پہلے امیر

معاویہ نے مسلمانوں سے آزادانہ طور پر مشورہ نہیں کیا بلکہ کم و بیش زبردستی اسکی بیعت کرائی گئی ۔ اور دوسرے خود اسکا کردار ایک نیک اور صالح مسلمان کا نہ تھا بلکہ وہ ھوس پرستی کو خدمت خلق اور خیر خواھی اسلام پر ترجیح دیتا تھا ۔

ان دونوں باتوں کو مد نظر رکھتے ھوئے امام حسین نے فیصلہ کیا کہ ان پر یزید جیسے امیر کی اطاعت واجب نہیں اور اگر انہیں اس اطاعت پر مجبور کیا جائے تو ان کا فرض ہے کہ خواہ ان کی جان و مال اور ان کے خویش و اقارب خطرے میں پڑیں، وہ یزید سے دفاعی جنگ کریں۔ اس فیصلے کے لئے ان کے پاس کئی نصوص قرآنی اور پہلے خلفاء کے اقوال تھے ۔ انہوں نے سورۂ کہف میں یہ پڑھا تھا ”لا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا واتبع ھوہ وکان امرہ فرطا (۱۸:۲۸)“ [یعنی اس شخص کی اطاعت مت کرو جس شخص کے دل کو ھم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور جس نے اپنی خواھش کی پیروی کی اور اپنے کردار میں حد اعتدال سے بڑھ گیا]۔ انہوں نے سورۂ شعرا میں یہ بھی پڑھا تھا ”لا تطیعوآ امر المسرفین الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون (۲۶:۱۵۱-۲)“ [ان لوگوں کے حکم کی اطاعت مت کرو جو حد سے بڑھ گئے اور جو ملک میں اصلاح کی بجائے فساد برپا کرتے ھیں]۔ انہوں نے سورۂ انسان میں یہ بھی پڑھا تھا ”لا تطع منھم اثما او کفورا (۷٦:۲۴)“ [ان لوگوں میں کسی بد عمل اور ناشکرے کی اطاعت مت کرو]۔ ان کو خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رض کا پہلا خطبہ یاد تھا جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ جب تک میں خدا اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق تم کو حکم دوں تم پر میری اطاعت واجب ہے لیکن اگر میں ان کے خلاف کوئی حکم دوں تو تم مجھے متنبہ کرو۔ انکو خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رض کا وہ عدل بھی یاد تھا کہ جب انکو اس بات کی جواب دھی دینا پڑی کہ مال غنیمت سے انکو اتنا کپڑا کیسے مل گیا کہ انہوں نے قمیص اور تہبند دونوں بنائے جبکہ دوسرے مسلمانوں کو صرف اتنا کپڑا ملا جس سے صرف ایک ملبوس بن سکتا تھا اور انہیں بتلانا پڑا کہ ان کے بیٹے نے اپنا حصہ ان کو برضا و رغبت دیدیا تھا۔ ان سب شواھد کی موجودگی میں حضرت امام حسین علیہ کا فیصلہ بالکل حق بجانب اور تعلیم اور روح اسلام کے عین مطابق تھا اور اسی بناء پر خواجہ معین الدین چشتی نے فرمایا ہے کہ

سرداد ، نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ ھست حسین

اس تشریح کے بعد آپ اقبال کے شعر کی طرف دوبارہ رجوع کیجئے

قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

یہ شعر اقبال کی نظم بعنوان ''ذوق و شوق'' سے لیا گیا ہے جو بال جبریل میں شامل ہے اور جس میں عنوان کے نیچے یہ اطلاع مرقوم ہے کہ ''ان اشعار میں سے اکثر فلسطین میں لکھے گئے''۔ اقبال کا فلسطین کا دورہ لندن کی گول میز کانفرنس سے واپسی پر ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ اور بال جبریل پہلی مرتبہ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ گویا اس نظم کے اشعار کا تاریخی پس منظر وہ سیاسی اور معاشی حالات تھے جو اس وقت اسلامی ممالک میں رو پذیر اور اثر انداز تھے۔ اس لئے ان حالات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا اس شعر کے معنی سمجھنے کے لئے نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہے۔

اس وقت مراکو کے ساحلی علاقہ پر سپین اور باقی حصوں پر فرانس کی جابرانہ حکومت تھی، الجریا اور تیونس فرانس کے قبضہ اقتدار میں تھے اور وہاں کے عرب باشندوں کو حکومت میں عمل دخل نہ تھا۔ طرابلس پر ۱۹۱۲ء کے بعد اٹلی نے غاصبانہ حکومت قائم کر رکھی تھی اور وہاں آزادی پسند مسلمانوں پر طرح طرح کے ظلم و ستم روا تھے۔ مصر میں شاہ فواد کی نام نہاد حکومت تھی لیکن حقیقی اقتدار انگریزوں کے ہاتھ میں تھا جو اس بات سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں نیشنل اسمبلی کے لئے جتنے بھی انتخابات ہوئے اس میں حالانکہ وفد پارٹی کے اراکین کثرت سے آئے لیکن انہیں زیادہ مدت کے لئے حکومت کرنے کا موقع نہیں دیا گیا مثلاً ۱۹۳۰ء کے انتخابات میں نحاس پاشا کی قیادت میں وفد پارٹی کے ممبروں کی کثرت تھی مگر انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور شاہ فواد کی اغماض سے حکومت بنانے کا کام اسمعیل صدقی پاشا کے سپرد کیا گیا۔ اور جب بادشاہ کی بدعنوانیوں اور انگریزوں کی چالباری سے تنگ آکر اسمعیل صدقی پاشا جیسے اعتدال پسند آدمی نے بھی ۱۹۳۳ء میں استعفےٰ دے دیا تو حکومت کی باگ ڈور شاہی اسلاک کے ڈائرکٹر کے سپرد کر دی گئی اس طرح جمہوریت کا گلہ گھونٹ دیا گیا، اور یہ حالت ۱۹۳۶ء تک برقرار رہی۔ فلسطین پر ۱۹۱۸ء میں ترکی کی شکست کے بعد انگریزوں نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا اور ان کی یہود پرور پالیسی کے ماتحت مسلمان عربوں کو ان کے گھروں اور زمینوں سے بیدخل کر کے ان کی جگہ ہر سال زیادہ تعداد میں یہودی آباد کئے جا رہے تھے جس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ۱۹۳۲ء میں

نوھزار، ۱۹۳۳ء میں بیس ھزار، ۱۹۳۴ء میں بیالیس ھزار اور ۱۹۳۵ء میں باسٹھ ھزار یہودی فلسطین میں جا کر آباد ھوئے ان کا اس غاصبانہ کاروائی پر اکتفا نہیں تھا بلکہ انگریزوں کی شہ پاکر اب ان کا تقاضا یہ تھا کہ ھزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں یورپ اور امریکہ سے یہودی لاکر وھاں آباد کئے جائیں جس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ ھوتا کہ تقریباً تمام فلسطین میں جہاں مدت مدید سے مسلمانوں کی کثرت تھی، مسلمانوں کا نام و نشان باقی نہ رھتا ۔ اور یہودیت کا یہ زھریلا خنجر عالم اسلام کی پسلی میں ھمیشہ کے لئے پیوست ھو جاتا ۔ چنانچہ اس شر انگیز اور عافیت سوز اقدام کے خلاف برمحل جہاد نہ کرنے کا نتیجہ وھی ھوا جس کا خدشہ تھا ۔ شام کی حالت بھی ویسی ھی افسوسناک تھی جیسی دوسرے عرب ممالک کی ۔ وھاں ۱۹۲۸ء میں اعتدال پسند عناصر نے ایک نیم جمہوری طرز حکومت کا دستور تیار کیا لیکن فرانس نے، جس کے قبضہ اقتدار میں یہ ملک تھا، یہ دستور بھی رد کر دیا اور ۱۹۳۰ء میں منتخب شدہ اسمبلی کو برخاست کر کے ایک اپنا بنایا ھوا آمرانہ طرز کا آئین ملک پر ٹھونس دیا اور جب اس مسلط کردہ آئین کے ماتحت منتخب کئے ھوئے اراکین نے ذرا آزادی فکر و عمل دکھائی تو فرانس کو یہ بات بھی گوارا نہ ھوئی اور ۱۹۳۴ء میں فرانس کے ھائی کمیشن نے اسمبلی توڑ کر زمام حکومت اپنے ھاتھ میں لے لی ۔ حجاز میں ترکی کی شکست کے بعد انگریزوں نے شریف حسین کو دکھاوے کے لئے تخت پر بٹھا دیا لیکن حقیقی اقتدار اپنے ھاتھ میں رکھا ۔ اور جب شریف حسین نے ذرا آزادی دکھانی شروع کی تو انہوں نے اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جس کے نتیجے میں وہ ان کے دوسرے حلیف عبدالعزیز ابن سعود سے شکست کھا گیا، اور وھاں ایک آزاد حکومت تو قائم ھو گئی لیکن اس کی بنیاد جمہوری اقدار پر نہ تھی۔ عراق میں پہلے تو انگریزوں نے شریف حسین کے بیٹے عبداللہ کے ذریعہ حکومت کی لیکن جب شام سے فرانسیسیوں نے شاہ فیصل کو خارج کر دیا تو انہوں نے اس کو عراق کے تخت پر بٹھادیا ۔ اور وھاں کے سیاسی بحران کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۲۱ء سے لیکر ۱۹۳۳ء تک پندرہ بار وزارت میں تبدیلیاں ھوئیں اور فیصل اول کی وفات کے بعد ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء کے مختصر عرصے میں وزارت میں اکیس بار تبدیلیاں ھوئیں ۔ لیکن ان سب تبدیلیوں میں عوام الناس کا ھاتھ کم اور سیاستدانوں اور بڑے بڑے جاگیرداروں کی ریشہ دوانیاں زیادہ تھیں یہ تو حالت تھی عرب ممالک کی ۔ اس کے علاوہ غیر عرب ممالک میں سے ترکی اتاترک کی عظیم الشان کامیابی کے بعد انگریزوں

اور ان کے پٹھوؤں کے چنگل سے آزاد ہوچکا تھا ۔ اور اس طرح ایران بھی رضا شاہ کبیر کی ہمت اور استقلال سے انگریزوں اور روسیوں کے اثر سے آزاد ہو چکا تھا ۔ گو بعد میں رضا شاہ کو اپنی آزادانہ پالیسی کی قیمت تخت سے علیحدگی کی صورت میں ادا کرنا پڑی ۔ افغانستان میں شاہ امان اللہ کے آزاد خیال گیارہ سالہ دور حکومت کے بعد انگریزوں کی ریشہ دوانیوں نے بچہ سقہ جیسے ظالم اور سفاک آدمی کے ہاتھوں ان کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا اور گو نادر شاہ کے بروقت اقدام نے افغانستان کو اس جاہل آدمی کے چنگل سے جلد ہی آزاد کرالیا لیکن وہ خود ۱۹۳۲ میں خنجر قاتل سے شہید کر دیئے گئے ۔ ہندوستان اور ملائشیا کے مسلمان انگریزوں کی غلامی میں تھے اور انڈونیشا کے مسلمان ہالینڈ کے قبضہ اقتدار میں تھے ۔ تو مختصراً یہ تھی اس زمانے میں اسلامی ممالک کی سیاسی اور معاشی حالت ، یعنی اغیار کی غلامی ، یا سیاسی بحران یا اقتصادی انحصار اور تقریباً ہر جگہ صحیح جمہوریت کا فقدان ۔ اقبال جس سے اسلامیوں کا سوز و ساز پنہاں نہ تھا اور جو جمہوریت کو اسلامی سیاست کا ایک اہم جزو مانتا تھا ، ان حالات کو دیکھ کر اور پڑھ کر خون کے آنسو روتا ہوگا اور اس کے حسرت بھرے دل سے یہ فریاد اٹھتی ہوگی کہ اے خدا اب بھی جب کہ بمصداق آیتہ قرانی ”لا تقولوالمن یقتل فی سبیل اللہ امواتابل احیاء“ صلہ شہید حیات جاودانی ہے کیا تمام عالم اسلام میں ایک شخص ایسا بھی نہیں اٹھتا جس کے دل میں حق و صداقت اور عدل وانصاف کے لئے مرنے کی تڑپ ہو اور جو آمرانہ جور اور جابرانہ ستم کے خلاف اہل و عیال اور جان و مال کی بازی لگا کر دنیا میں رسم شبیری پھر تازہ کرے ۔

تیسرا جام جو میکدہ اقبال سے میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاھتاھوں وہ ایک شعر نہیں بلکہ ایک قطعہ سے چار اشعار جو انہوں نے دعا کی استجابت کے بارے میں لکھے ھیں ۔ وہ اشعار یہ ھیں

تیری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تیری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

ویسے تو اقبال نے خودی ، مقام خودی ، تربیت خودی وغیرہ کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے ۔ لیکن ان اشعار سے جس حقیقت کی طرف میں آپ کی توجہ

مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ اس قسم کی دعائیں ہیں جو پاکستان میں بعض اوقات انفرادی لیکن زیادہ تر اجتماعی طور پر مانگی جاتی ہیں۔ عام طور پر لوگ جب روزانہ نماز کے بعد دعائیں مانگتے ہیں تو وہ خموشی اور خشوع کے ساتھ اور مختصر ہوتی ہیں اور ان میں اکثر اپنے احوال کی بہتری یا اپنے گناہوں کی مغفرت کی التجا کرتے ہیں ۔ لیکن جو دعائیں جمعہ اور عیدین کی نمازوں کے بعد یا جلسوں اور مجلسوں میں مانگی جاتی ہیں ان کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے اول تو وہ خشوع و خضوع سے زیادہ درد و کرب اور شدت و اضطراب سے مانگی جاتی ہیں دوسرے ان میں اللہ تعالیٰ سے اس قسم کی فرمایشیں کی جاتی ہیں کہ وہ گردش ایام پھیر دے ، مسلمانوں کو دنیاوی دولت سے مالامال کر دے ، ان کے حکمرانوں کو یہ توفیق دے کہ وہ اسلامی اصولوں پر کاروبار حکومت چلائیں ، ان کے دشمنوں کو تباہ و برباد کر دے اور ان کے بدخواہوں کے شہروں ، قصبوں اور گھروں کو آسمان سے کسی قسم کا طوفان نازل کر کے مسمار کر دے۔ تیسرے یہ دعائیں بڑی طولانی ہوتی ہیں جن میں پیش امام یا دعاگو اپنا زور فصاحت اردو اور عربی دونوں زبانوں میں دکھاتے ہیں اور تکرار مدعا اور اعادہ الفاظ سے کافی وقت خرچ کیا جاتا ہے ۔

اگر اس قسم کی دعاؤں کی ساخت پر غور کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ان میں سے بعض مضامین تو ایسے ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر اور اس میں مسلمانوں کی حسب منشا تبدیلی سے ہوتا ہے جس کی نسبت قران مجید میں بار بار یہ فرمایا گیا ہے کہ ''لن تجد سنۃ اللہ تبد یلا (۲۳:۴۸ و ۶۲:۳۳)'' یعنی اللہ تعالیٰ کے قوانین قدرت اٹل ہیں اور ان بندوں کی فرمائش پر تبدیلی کا امکان نہیں ، آفتاب اپنے وقت مقرر پر طلوع ہوگا اور ہزار دعائیں اس کے اوقات یا اس کے گرد زمین کی گردش میں دخل اندازی نہ کر سکیں گی ۔ بارش کے سیلاب یا سمندر کے طوفان صرف اسی وقت آئینگے جب موسمی اور ارضی حالات ان کے لئے سزا وار ہونگے اور اس قسم کی آفتوں سے گناہگاروں اور بیگناہوں کے کمزور گھر یکساں طور پر برباد ہوں گے ۔ جہاں تک مسلمانوں کی حالت کی بہتری اور ان کے دشمنوں کی ابتری کا تعلق ہے ، تو قران مجید کی رو سے ان کا مداوا خود مسلمانوں کی ہمت پر منحصر ہے ۔ کیونکہ قران مجید نے صاف طور پر اعلان کردیا ہے کہ '' لیس لانسان الا ماسعیٰ '' کہ انسان کو جس میں مسلمان بھی شامل ہیں ، خزانہ الٰہی سے صرف اس کی کوشش اور سعی کے مطابق ملیگا ۔ اور چونکہ وہ رب العالمین ہے اور بمصداق '' وان اللہ لیس بظلام

للعبید (۲۲:۱۰) '' یعنی وہ اپنے بندوں پر ظلم یعنی ناانصافی روا نہیں رکھ سکتا اس لئے یہ بات اس کی شان ربوبیت اور صفت عدل و انصاف کے خلاف ہے کہ وہ اپنے بعض بندوں کو ان کی سعی و کوشش سے زیادہ اور بعض کو کم دے باقی رہیں اس قسم کی دعائیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دشمنوں پر دنیا میں اپنا عذاب نازل کرے ۔ تو اس کے متعلق قران مجید میں ارشاد ہے کہ "یعذ بھم اللہ بایدیکم'' یعنی وہ مسلمانوں کے دشمن کو ان کے ہاتھوں سے سزا دیتا ہے یعنی مسلمانوں کا زور و بازو اس مقصد کے لئے اللہ کا آلۂ کار بنتا ہے ۔ یہ وہی مضمون ہے جسکے متعلق علامہ نے دوسری جگہ فرمایا ہے کہ

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفرین کار کشا کار ساز

یا اس قسم کی دعائیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے حاکموں کو یہ توفیق دے کہ وہ ان پر اسلامی اصولوں کیساتھ حکومت کریں ۔ تو یہ بھی خود مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے حاکم کے کردار کی نگاہ بانی کریں ۔ اور اگر وہ دیکھیں کہ وہ لوگ صراط مستقیم سے منحرف ہو رہے ہیں تو ان میں اتنی ہمت اور جرأت ہونی چاہئیے کہ وہ ان کو اپنی غلطی سے آگاہ کریں ۔ وہ اس بات میں حق بجانب نہیں کہ اپنے فرائض کو اپنے خدا کے سپرد کر کے خود آرام طلب اور گوشہ نشیں ہو جائیں اقبال نے فرمایا ہے

ہے آئین جوان مرداں ، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اس قسم کی دعاؤں کے متعلق جن میں اللہ تعالیٰ سے اس کی قضا و قدر بدلنے کی فرمائش کی جاتی ہے ، اقبال کا ایک اور خوبصورت قطعہ فارسی میں ہے جس میں انہوں نے شہنشاہ عالمگیر کے اس خط کو منظوم کیا ہے جو اس نے اپنے ایک فرزند کو لکھا تھا جس کی نسبت اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے والد کی موت کے لئے دعا مانگتا تھا۔ فرماتے ہیں

ندانی کہ یزداں دیرینہ بود — بسے دید و سنجید و بست و کشود
ز ما سینہ چاکاں ایں تیرہ خاک — شنید است صد نالۂ دردناک
بسے ہمچو شبیر در خون نشست — نہ یک نالہ از سینہ اوگسست
نہ از گریہ پیر کنعاں تپید — نہ از درد ایوب آہے کشید

مپندار آں کہنہ نخچیر گیر
بدام دعائے تو گردد اسیر

ممکن ہے کہ بعض سامعین کے دل میں یہ خیال گذرے کہ دعا کے متعلق اقبال کے بعض اشعار کی میں نے جس طرح تشریح کی ہے ان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اقبال سرے سے ہر قسم کی دعا مانگنے کے حق میں نہیں، غلط ہو گا۔ کیونکہ ایسا استدلال نہ صرف قران شریف کی بعض آیات، جن میں مسلمانوں کو دعا مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے اور دعائیں سکھائی گئی ہیں، کے خلاف ہوگا۔ بلکہ خود اقبال کے بعض اجزائے کلام سے متضاد ہوگا، جس میں انہوں نے براہ راست یا اظہار تمنا کی صورت میں دعا مانگی ہے۔ مثلاً بانگ درا میں بچے کی دعا کے عنوان سے وہ نظم جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

یا اسی مجموعہ میں وہ نظم جسکا عنوان " ایک آرزو " ہے، جس میں مختلف خوبصورت آرزوؤں کا دعاؤں کی شکل میں اظہار کیا گیا ہے مثلاً

پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی مؤذن
میں اس کا ہمنوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر وحرم کا احسان
روزن ہی جھونپڑی کا مجھکو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ میری دعا ہو

یا ساقی نامہ (بال جبریل) کا وہ بند جس میں اس قسم کی مخلصانہ آرزوؤں کا دعا کی شکل میں اظہار کیا گیا ہے کہ

جوانوں کو پیروں کا استاد کر — فرد کو غلامی سے آزاد کر
دل مرتضےٰ سوز صدیق دے — تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
مرا عشق میری نظر بخش دے — جوانوں کو سوز جگر بخش دے

اگر اس قسم کی دعاؤں، آرزوؤں، امنگوں کا جنہیں اقبال نے اپنے کلام میں جگہ دی ہے، تجزیہ کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ان میں اس قسم کی دعائیں ہرگز شامل نہیں ہیں، جنکا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اقبال کی دعاؤں کی نوعیت ہی بالکل الگ ہے۔ ان میں خدمت خلق، حصول علم، ریاضت نفس، وغیرہ کی تلقین ہے اور اس لئے جس بند سے میں نے دعا کے متعلق دو شعر لئے ہیں اسی میں آگے چل کر اقبال فرماتے ہیں کہ

تیری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
میری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

جس قسم کی خود غرضانہ یا تباہی طلب دعاؤں کا میں نے ذکر کیا ہے اور جن کے بدلنے کی اقبال نے دعا مانگی ہے ان کا ابھی ایک پہلو باقی ہے جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا وہ ہے ان کی جا و بیجا طوالت ، تکرار الفاظ ، اعادہ اظہار مدعا ۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ نماز بجائے خود بہترین دعا ہے ۔ اور اسکے بعد بشرطیکہ وہ خشوع و خضوع سے ادا کیجائے ، کسی لمبی اور طویل دعا کی ضرورت نہیں رہتی ۔ چنانچہ دوسرے اسلامی ممالک میں ایسی لمبی دعاؤں کا رواج نہیں ۔ اسی ضمن میں علامہ مرحوم نے اپنی ایک نظم بعنوان '' غلاموں کی نماز '' میں ایک واقع کا ذکر کیا ہے کہ جب ترکی کے ہلال احمر کا ایک وفد لاہور آیا ، اور اسکے اراکین شاہی مسجد میں نماز پڑھنے گئے تو پیش امام صاحب نے نماز کو خوب طول دیا ، جس پر بقول اقبال

کہا مجاھد ترکی نے مجھ سے بعد نماز
طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام
وہ سادہ مرد مجاھد وہ مومن آزاد
خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نماز غلام
ہزار کام ہیں مردان حر کو دنیا میں
انہیں کے ذوق عمل سے ہیں امتوں کے نظام
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام

میں نے اس مقالے میں اقبال کے صرف چند اشعار کے معنی ، جو میری سمجھ میں آئے آپ کے پیش خدمت کئے ہیں۔ ان کا کلام بحر ذخار کیطرح اس قسم کے پر معنی اشعار کے موتیوں سے بھرا ہوا ہے چونکہ اب وقت ختم ہورہا ہے ، اس لئے میں اس مقالے کا اختتام خود ان کے ایک شعر پر کرتا ہوں جس میں صرف ایک لفظی تغیر کیا گیا ہے۔

قلندر کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالہ